(10)

5



زندگی سے زندگی کی طرف



ن

cert

زندگی سے زندگی کی طرف

نازش پرتاپگڈھی

بار اوّل ——— ایک ہزار

قیمت ——— ایک روپیہ

کاتب ——— رشید اختر

مطبع ——— نیشنل آرٹ پرنٹرس سرائے گڑھی، الہ آباد

ناشر:-
ساہتیہ کار سنسد - پرتاب گڈھ

اگست سنہ ۴۲ء کی تحریک آزادی سے متعلق

ایک تخئیلی منظومیہ :-

اس زندگی کو کبھی فنا نہیں، یہ بقائے دوام ہے
اگر زندوں کی طرح رہنا ہے تو ــــــ
سروں پر موت کا طوفان رہنے دو!
اور قدموں کے تلے موت کا دریا بہنے دو!!

قاضی نذر الاسلام

ہوئی تاخیر

یہ منظومیہ ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو جانے کے بعد چند برسوں تک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں خیال آیا کہ اسے کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ میری درخواست پر محترم سید احتشام حسین صاحب نے چند سطروں کا پیش لفظ بھی تحریر فرما دیا — پھر — نہ جانے کیا ہوا کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا اور سولہ سترہ برسوں کی طویل مدت تک یہ منظومیہ کاغذات کے انبار میں دبا پڑا رہا۔ اس سلسلے میں وسائل و ذرائع کی کمی کے ساتھ ہی ساتھ مجھے خود اپنی کوتاہی اور تساہلی کا اعتراف بھی ہے۔

اب کہ اردو نظم اپنے اندازِ فکر اور اندازِ بیان دونوں ہی کے اعتبار سے کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ میں اس طویل منظومیے کو اربابِ فکر و نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں ممکن ہے میری محنت ضائع ہونے سے بچ جائے۔

شکر گزار ہوں اپنے ان احباب کا جن کے تعاون اور مالی امداد نے، بہت زیادہ بعد از وقت ہی، اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کی صورت پیدا کر دی۔

محترم بھائی جناب عباس حسینی صاحب مدیر ماہنامہ نکہت، الہ آباد میرے خصوصی شکریئے کے مستحق ہیں کہ جن کی امداد اور قیمتی مشورے میرے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نازش پرتاپگڈھی

پرتاپگڈھ۔ ۲؍ستمبر ۱۹۷۶ء

پیشِ لفظ

جناب نازش پرتابگڈھی دورِ حاضر کے اُردو شاعروں میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، جنھوں نے اُردو ادب میں خوشگوار اضافے کئے ہیں۔ شعر کی دیوی کو رام کرنے کے لئے جس خلوص، ریاضت اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے نازش صاحب نے اس سے کبھی گریز نہیں کیا، اسی لئے آج ان کے انداز اور خیال دونوں میں پختگی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔

غیر ملکی حکومت کے دَوران میں نازش صاحب اپنی نظموں کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو ابھارتے رہے ہیں کہ وہ بدیسی سامراج کی غلامی کا جُوا اپنے کاندھوں سے اُتار کر پھینکدیں دورِ آزادی کے پچھلے دس گیارہ برسوں میں یہ اپنی نظموں کے ذریعہ جمہوریت، سوشلزم، نامذہبیت، یک جہتی اور قومی اتحاد کے نظریئے کی برابر تبلیغ کرتے رہے ہیں، انکی نظمیں، قومی اور جمہوری ادب میں یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

نازش صاحب کی طویل نظم "زندگی سے زندگی کی طرف" جس کے بیشتر حصے میں نے ان سے سُنے اور رسالوں میں پڑھے ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ ہمیشہ فکروفن دونوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

میں موجودہ دور میں غزل کے فروغ سے خوفزدہ یا بزدل نہیں بلکہ خوش ہوں لیکن اس بات کا رنج ضرور ہے کہ غزل کے سامنے غور و فکر سے لکھی ہوئی طویل نظموں کو لوگ نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لئے میری نگاہ میں اس نظم کی اور زیادہ قدر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہماری جنگِ آزادی کے ایک اہم موڑ کے متعلق نازش صاحب کی یہ طویل اور خوبصورت نظم مقبول ہوگی۔

لکھنؤ یونیورسٹی ۵۸ء

سید احتشام حسین

حرفِ آغاز

جنگِ آزادی کی تاریخ سنانے والا
چندِ افراد کے افسانوں سے آگے نہ بڑھا
اَن گنت لوگوں نے پی اوک سے صہبا لیکن
ذکرِ مے خواری کا پیمانوں سے آگے نہ بڑھا

بے شمار اشکوں نے سیراب کیا ہے جس کو
صحنِ گلشن میں وہی جوشِ نمو پھیلا ہے
رزم گاہِ حق و باطل کے گڑے سینے پر
صدہا گمنام شہیدوں کا لہو پھیلا ہے

یہی گمنام جیالے ہیں جو آگے بڑھ کر
ہر نئی صبح کو تنویر دیا کرتے ہیں
یہ ہر اک دور میں برباد رہے ہیں لیکن
یہی ہر دور کی تعمیر کیا کرتے ہیں

روئے تہذیب کو ملتی ہے انھیں سے رونق
رنگ آتے ہیں فسانے میں انھیں کے بل پر
کبھی سلطان، کبھی شاہ — کبھی میرِ سپاہ
نرد ابھرتے ہیں زمانے میں انھیں کے بل پر

یہی گمنام سے انساں، یہی اَن جانے لوگ
تیز طوفانوں کے سر بڑھ کے کچل دیتے ہیں
یہ — جو تاریخ کے صفحوں پہ نہیں ہوتے مگر
یہی تاریخ کا عنوان بدل دیتے ہیں

نازش

جولائی ۱۹۵۱ء

جانے اور اَن جانے شہیدانِ وطن کے نام

زندگی میں ہے بڑا جوشِ نمو، یاد رہے
رنگ لاتا ہے شہیدوں کا لہو، یاد رہے

کردار :-

بوڑھا دادا

ماضی کی صحت مند روایات

تاریخ

جو اپنے آپ کو دُہراتی ہے

وقت

جو کسی کا انتظار نہیں کرتا، کبھی نہیں ٹھہرتا

شاعر

جو اپنے زمانے اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے

سختیٔ شب

جو بالآخر فنا ہوتی ہے

عوام

جو قوت و حیات کی نمایندگی کرتے ہیں

انسان

جو زندہ رہا کرتا ہے

رفتار

صفحہ

ابتدائیہ

حسبِ معمول کسی گاؤں میں کچھ رات گئے
لوگ چوپال کو آباد کئے بیٹھے ہیں
حسبِ معمول کہن سال و جہاندیدہ لوگ
اپنے ماضی کی روایات لئے بیٹھے ہیں ۵
حسبِ معمول "جواں چہروں" نے حلقہ باندھا
قصہ سننے کے لئے۔ جس سے گئے تھوڑی رات
اور سلگتے ہوئے حقے کا سہارا لے کر
بوڑھے دادا نے کہا۔ ہاں، یہ ہے تاریخ کی بات

تاریخ بتاتی ہے

جب کبھی کاکلِ ہستی نے سنورنا چاہا
جب بھی انسان نے پستی سے اُبھرنا چاہا
جب کسی ماتھے پر چمکی ہے صداقت کی کرن
جب کسی ہونٹ پہ مہکا ہے حقیقت کا چمن
اُس گھڑی موت کے پیاروں کو جلال آیا ہے
کالے قانون کے سینے میں اُبال آیا ہے
رہگذاروں پہ کئی سنگِ گراں جاگے ہیں
نیزہ و خنجر و شمشیر و سناں جاگے ہیں
تیرگی نور کے دھاروں پہ مگر چھا نہ سکی
موت سے کھیلنے والوں کو اجل پا نہ سکی
ظلمتِ جور یہ مانا کہ کڑی ہوتی ہے
عمر اندھیروں کی مگر چار گھڑی ہوتی ہے
زندگی خاک پہ جب گرتی ہے زخموں سے نڈھال
دیکھے اس وقت کوئی عظمتِ آدم کا جلال
موج دبتی ہے تو پھر سر سے گزر جاتی ہے
چوٹ کھاتی ہے جو ناگن تو بپھر جاتی ہے
زندگی خوں میں نہاتی ہے سنورنے کے لیے
موت کی آگ میں تپتی ہے نکھرنے کے لیے

ظلمتیں چاند ستاروں کو جگا دیتی ہیں
ناگنیں اپنے ہی بچّوں کو چبا لیتی ہیں
کفر بڑھتا ہے تو خود ہوتا ہے ایماں پیدا
آگ سے ہوتا ہے اندازِ گلستاں پیدا
خاک پر خون جب انساں کا بکھر جاتا ہے
چہرہ مستقبلِ زرّیں کا نکھر جاتا ہے
ایک تحریک کی رفتار اُبھر آتی ہے
اک نئے دَور کی للکار اُبھر آتی ہے
اک وہ تحریک، جو قوت کے مٹائے نہ مٹے
اک وہ آواز، جو طاقت کے دبائے نہ دبے

ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
ظالمو! راہ سے انسانوں کی ہٹ جاؤ تم

اسی آواز سے افسونِ ستم ٹوٹا ہے
اسی گلبانگ کے سینے سے گجر پھوٹا ہے
لاکھ تخریب ہو — تعمیر نہیں رُک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

بوڑھا دادا

ہاں، تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ یوں ہی ہے تاریخ
جب بھی انسان نے پستی سے اُبھرنا چاہا
جب کبھی گیسوئے ہستی نے سنورنا چاہا
اُس گھڑی موت کے پیاروں کو جلال آیا ہے
کالے قانون کے سینے میں اُبال آیا ہے
لیکن انسان ـــــ اُبھرتا ہی چلا جاتا ہے
ہر طرف نور بکھرتا ہی چلا جاتا ہے
کون سا قطرۂ غم موجۂ طوفاں نہ ہوا
لیکن انسان مصائب سے ہراساں نہ ہوا
اپنے رستے میں بھی یہ دھوپ کڑی آئی تھی
ہند والوں پہ بھی ایک ایسی گھڑی آئی تھی
پاس کچھ اور سمٹ آؤ ـــــ بتاؤں تم کو
وہ کہانی، جو حقیقت ہے ـــــ سناؤں تم کو

پسِ منظر بولتا ہے

خامشی چھائی ہے اور رندوں کے جی چھوٹے ہیں
زہر آلود ہے مے، ساغر و خم ٹوٹے ہیں
ہر طرف بکھرا چلا جاتا ہے ظلمت کا غبار
دوش پر لادے ہوئے مردہ اُمنگوں کے مزار

ذوقِ نغمہ ہی نہیں حسنِ سماعت کی قسم
زندگی سوگ میں ہے جبرِ امارت کی قسم
گردِ آلام سے انسان اٹا جاتا ہے
خونِ جمہور پیالوں میں بٹا جاتا ہے
خون کے جلنے کی بدبو کے سوا کچھ بھی نہیں
زیست ڈھلکے ہوئے آنسو کے سوا کچھ بھی نہیں

شہیدوں کی آواز

وہی بے نور نگاہیں، وہی اُترے چہرے
زیست کی زلفِ پریشاں کو سنوارا نہ گیا
دوستو! ہم وطنو! ایک زمانہ گزرا
دار سے ہم کو مگر اب بھی اُتارا نہ گیا
تن پہ جو زخم کھلے وہ تو عیاں ہیں سب پر
روح نے چوٹ جو کھائی وہ دکھائیں کس کو
راہبر خواب زدہ، تم ہو فریبوں کے شکار
اپنی بربادی کا افسانہ سُنائیں کس کو
کل کی ہے بات کہ گلشن کو بچانے کے لئے
برق کی زد پہ رکھا اپنا نشیمن ہم نے
دستِ گلچیں جو بڑھا توڑنے کوئی غنچہ
پیش کر دی اُسے خود اپنی ہی گردن ہم نے

چپ تھے مُرغانِ چمن، فکر میں تھی بُلبُل بھی
اپنے لب سی کے انھیں زمزمہ خوانی دیدی
جن کا رس چوس کے بدمست ہوئی فصلِ خزاں
ان شگوفوں کے لئے ہم نے جوانی دیدی

ہم نے ہاتھوں کی لکیروں سے بنائی رگِ گل
دامنِ باغ میں صد لعل و گہر ٹانک دیئے
جن پہ صرصر نے کوئی پھول بھی کھلنے نہ دیا
ہم نے ان شاخوں پہ خود اپنے ہی سر ٹانک دیئے

ہم کو قربانی و ایثار کا بدلا یہ ملا
اب بھی ہیں دار پہ پھیلی ہوئی باہیں اپنی
دوستو! ہم وطنو! کوئی تو کروٹ بدلو
تک رہی ہیں تمھیں بے نور نگاہیں اپنی

غیر کے ظلم و ستم سے بھی جو خم ہو نہ سکا
وہی سر بارِ ندامت سے جھکا جاتا ہے
گولیاں کھا کے بھی کل تک جو دھڑکتا ہی رہا
اپنے سینے میں وہ دل آج رکا جاتا ہے

ہم نے پھولوں کی تمنّا میں مٹایا خود کو
تم نے کانٹوں کے لئے جوشِ نمو بیچ دیا

ہم نے میداں میں بہایا جو چمن کی خاطر
تم نے بازار میں لا کر وہ لہو بیچ دیا
افقِ دار سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں
جو کرن اٹھتی ہے تاریک میں کھو جاتی ہے
آدمی کوڑے کے ڈھیروں پہ پلا کرتا ہے
زندگی ہانپ کے فٹ پاتھ پہ سو جاتی ہے
روٹیاں اب بھی وہی "خواب کا شہزادہ" ہیں
جاگتی آنکھوں کو ملتا ہی نہیں جن کا نشاں
اب بھی محنت کے عوض داغِ جگر ملتا ہے
اب بھی کھلیان چلا جاتا ہے بنئے کے یہاں
بند ہے اب بھی تجوری میں کرن سُورج کی
وہ ہیں آزاد کہ جو نور چُرا لیتے ہیں
لوٹ لیتے ہیں اک اک ماتھے کی برنائی کو
ایک اک مانگ کا سیندور چُرا لیتے ہیں
وہ جو اس دورِ تشدّد میں ہوئے نذرِ ستم
لوری ان ہونٹوں پر آتی ہے تو جل جاتی ہے
ماں کی تقدیس بہک جاتی ہے بچّے کے لئے
ممتا بھوک کی بھٹّی میں پگھل جاتی ہے

صرف ارمان ہے سینوں میں، نہیں ذوقِ عمل
صرف خاکے ہیں ۔۔ مکمل کوئی تصویر نہیں
اب بھی ہیں دار پہ ہم لوگ ہمیشہ کی طرح
خوابِ آزادی ابھی خواب ہے، تعبیر نہیں
کتنی شمشیروں کو خون اپنا پلانا ہے ابھی
کتنے غم اور ہیں باقی جنھیں سہنا ہوگا
دوستو! ہم وطنو! تم ہی بتاؤ کہ ہمیں
کتنی دیر اور ابھی دار پہ رہنا ہوگا
کب وہ دن آئے گا جس دن کی تمنا میں مرے
کب یہاں سلسلۂ دار و رسن ٹوٹے گا؟
سرخیٔ صبح کی حسرت میں بہایا جس کو
کب تک اس خاک سے اپنا وہ لہو پھوٹے گا؟

جب لہریں بیدار ہوئیں

قوت و حیات

ظلم کے، جور کے خوگر ہوں کہ طاقت کے خدا
کوئی بھی کر نہ سکا آج تک انساں کا شکار
ہم بپھر جائیں تو مشکل نہیں کوئی مشکل
کہ ہمیں پر ہے زمانے کی حکومت کا مدار
جوشِ وحشت کی ہتک، جوشِ جنوں کی توہین
سختیٔ حلقۂ زنجیر کو روتے رہنا
بشریت کے مشاغل میں ہے یزداں کا شکار
بشریت نہیں تقدیر کو روتے رہنا
کب تک آخر یہ نہیں آہستہ خرامی کے مزے
وقت آیا ہے کہ لیں صاعقہ گامی کے مزے

صدائے وقت

آج تک دور تھے میدانِ سیاست سے عوام
اب مگر تم کو بدلنا ہے زمانے کا نظام
ہر کرن تم کو اُبھرنے کا سبق دیتی ہے
ہر نئی صبح سُناتی ہے بغاوت کا پیام

آج تک موت کی چوکھٹ پہ رہے سر بہ سجود
لیکن اب وقت وہ آپہونچا کہ لازم ہے قیام
آج سے جادہ و منزل ہے تمھیں کو بننا
آج سے ڈھونڈھنا ہوگا کوئی رہبر نہ امام
رینگتے سانپوں کا سر بڑھ کے کچل دینا ہے
ڈال دینا ہے درندوں کے دہانوں میں لگام
حاکمیت کے یہ ناسور نہ رہنے پائیں
رہ نہ جائے کہیں سرمایہ پرستی کا جذام
اب کسی گوشے میں بھی خطرۂ گل چیں نہ رہے
اب کسی سمت بھی رہ جائے نہ صیاد نہ دام
ایک ہاتھ اور بھی، اک ہاتھ کی حاجت ہے اور
عالمِ نزع میں ہے جبر و تشدد کا نظام
اک نئی صبح، نئے دور کا آغاز کرو
رات کے پاس کہاں بادۂ جاں بخش کا جام
ساتھیو! ہم نفسو! جاگ اٹھو — تم پہ سلام

شاعر سوچتا ہے

ہائے اُس شوخ کے مہکے ہوئے رنگیں عارض
میں جنھیں روشِ گلزار سمجھتا آیا ہوں

مرمریں شانوں پہ بکھری ہوئی زلفوں کی لٹیں
میں جنہیں حسنِ شبِ تار بتا آیا ہوں
کسی پیشانی پہ اٹھلاتے ہوئے رنگوں سے
وہ شفق زار کھلے تھے کہ نظر وجد کرے
مے اُگلتی ہوئی شاداب نگاہوں میں مجھے
کچھ وہ انوار ملے تھے کہ سحر وجد کرے
سُرمئی رات کے دامن میں ستاروں کا ہجوم
مجھ کو محبوب کے آنچل کا خیال آیا تھا
گنگناتی ہوئی تنہائی میں مہکی سانسیں
کسی بجتی ہوئی چھاگل کا خیال آیا تھا
ہر شگوفہ کبھی دیتا تھا مجھے بھی پیغام
میری خاطر بھی نگاہوں کا سلام آتا تھا
ہاں کبھی میں نے بھی رنگین غزل لکھی تھی
ہاں۔ کبھی مجھ کو بھی اندازِ کلام آتا تھا
آج لیکن، بتِ طناز کے عشوؤں کی قسم
کاہشِ دل کا پتہ میری غزل دیتی ہے
چاہتا یہ ہوں کہ لکھوں وہی رنگیں باتیں
میری تخئیل مگر خون اگل دیتی ہے

استعارہ جو تراشوں تو وہ دے اُٹھتا ہے لو
سوچتا ہوں میں جو تشبیہہ، وہ جل جاتی ہے
لفظ بھڑکے ہوئے شعلوں کی طرح ہو نکلتا ہے
نظم رِستے ہوئے زخموں میں بدل جاتی ہے
رات گاتی نہیں اُلجھی ہوئی زلفوں میں کہیں
اب چمن زار نہیں یار کے رخساروں پر
زردیاں آ بھی چکیں عارض و پیشانی تک
راکھ کی تہہ ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر
اب کہاں برہمیٔ زلفِ دوتا کی باتیں
نکہتِ کاکلِ شب تاب لٹی جاتی ہے
حُسن نیلام ہوا جاتا ہے روٹی کے لیے
عظمتِ روشِ مہتاب بکی جاتی ہے
آج محبوب کے آنچل میں ہے زخموں کا ہجوم
مفلسی چاند ستاروں کا جگر چاٹ گئی
فکر نے چوس لیا رنگِ شفق عارض کا
بھوک ہونٹوں کا درخشندہ لہو چاٹ گئی
جس کو بھیجا تھا کبھی بادِ صبا نے پیغام
آج خلوت سے وہ بازار تک آپہونچی ہے

سوچتا یہ ہوں کہ میں عشق لڑاؤں کیونکر
زندگی آج حدِ دار تک آپہونچی ہے
تلخیٔ زیست کا احساس نہ ہوتا ہو جسے
وہ کوئی " خواب کا شہزادہ " ہے یا پتھر ہے
جہد کے دَور میں ہو فرصتِ مستی جس کو
میرے نزدیک وہ شاعر نہیں، بازی گر ہے
پھر کہیں قوتِ برداشت نہیں رہ جاتی
آنچ جب کاکل و رخسار تک آجاتی ہے
ایسے حالات میں اُس جانِ تغزّل کی قسم
بات پازیب سے تلوار تک آجاتی ہے

شاعر کا اعلان

رہبرو! راہ گرو! اپنے قدم تیز کرو
ساتھیو! ہم سخنو! اور قلم تیز کرو
آج قزّاق میں، عادل میں کوئی فرق نہیں
آج طوفان میں، ساحل میں کوئی فرق نہیں
سڑتی گلتی ہوئی لاشوں پہ محل بنتے ہیں
شاد وہ ہیں کہ جنھیں حرصِ جہانداری ہے
اَہرمن زادوں کے ہونٹوں پہ ہے مکروہ ہنسی
اور انسان کے سینے سے لہو جاری ہے

آدمی کے لئے یہ وقت کڑا ہے یارو!
زندگی کے لئے یہ رات بہت بھاری ہے
آج بھی بھوکے ہیں ہم، آج بھی ہم ننگے ہیں
کل بھی بھک منگے تھے اور آج بھی بھک منگے ہیں
دوستو! قوم نہیں، صرف ہمیں تکتی ہے
اب اسے صاحبِ تقدیر بنا دینا ہے
زندگی آج بھی فن کار سے مایوس نہیں
ساتھیو! گیتوں کو شمشیر بنا دینا ہے
خاک اور خون کا طوفان نہ بڑھنے پائے
اب کوئی ظلم بھی پروان نہ چڑھنے پائے
نور زادوں کو کوئی راہ سے بھٹکا نہ سکا
کوششیں کرتے رہے لیلیٰ شب کے فرزند
جامِ زہراب میں پنہاں ہے حیاتِ ابدی
موت پہونچا نہ سکی آج تک انساں کو گزند
تازیانوں کی صدا گونج رہی ہے ہر سو
اپنی آواز کریں اور بلند ——— اور بلند
مصرعہ و شعر سے لینے ہیں بڑے کام ہمیں
نئی دنیا کے، نئی بزم کے معمار ہیں ہم

ایک اک لفظ کو گلبانگِ درا کرتا ہے
کرنیں صبح کے لشکر کے علم دار ہیں ہم
یہ، جو پژمردہ بھی ہیں اور تھکے ہارے بھی
یہی الفاظ ستارے بھی ہیں، انگارے بھی

سختیِ شب جاگ اُٹھی

تم نے کیوں سرکش و بےباک ترانے گائے
تم نے کیوں آگ کے اور خون کے نغمے چھیڑے

شاعر نے کہا

تم مجھے سرکش و گستاخ تو کہتے ہو — مگر
کیا ہے ہنگامۂ بازار — یہ تم کیا جانو
نطق میں زہر گھلا کرتا ہے کن لمحوں میں
لفظ کب بنتا ہے تلوار — یہ تم کیا جانو
تم ہو طوفاں سے پرے عشرتِ ساحل میں مگن
کتنے رخنے ہیں سفینے میں، تمھیں کیا معلوم
دیکھ کر اپنے جگر گوشوں کا بوسیدہ لباس
ہوک جو اُٹھتی ہے سینے میں، تمھیں کیا معلوم
تم نے اوروں سے سنیں درد و الم کی باتیں
درد کس چیز کو کہتے ہیں — یہ مجھ سے پوچھو

اشکِ خونیں کا بیاں تم نے کتابوں میں پڑھا
اشک کیوں آنکھوں سے بہتے ہیں، یہ مجھ سے پوچھو
مجھ کو معلوم ہے گھٹتے ہوئے سینے کی جلن
ضبطِ گریہ کی مصیبت کو سمجھتا ہوں میں
کس طرح پیتا ہے اُمڈے ہوئے آنسو کوئی
اس قیامت کی اذیت کو سمجھتا ہوں میں
میں نے دیکھا ہے کہ ایک چاند سی پیاری بچّی
کس طرح ایک کھلونے کو بلک جاتی ہے
میں نے دیکھا ہے کہ اندوہ کی ماری ہوئی ماں
کس طرح بچّی کے کڑھنے پہ سسک جاتی ہے
میں نے دیکھا ہے کہ افلاس کا مارا ہوا باپ
کس طرح بچّے کو بہلاتا ہے۔ سمجھاتا ہے
میں نے دیکھا ہے کہ دودھ اور دواؤں کے بغیر
کس طرح ننھا سا بیمار تڑپ جاتا ہے
مجھ کو معلوم ہے اس چھوٹے سے زیور کا مآل
جو کسی بچّی کی گردن سے اُتر جاتا ہے
مجھ کو معلوم ہے اس چاندی کے بندے کا حال
ڈوب کر اشکوں میں جو بنیے کے گھر جاتا ہے

میرے سینے پہ ہے ہر چاک گریبانِ گُل
میں نے دامن میں سمیٹے ہیں چمن کے آنسو
میری نظروں میں وہ پیوند لگی چادر ہے
جس میں کھو جاتے ہیں نادار بہن کے آنسو
تم فقط ظلم کے پیکر ہو، تمھیں کیا معلوم
گرم ہوتا ہے جو ماحول تو جلتا ہے دماغ
میری دُنیا میں کبھی آؤ تو سمجھو تم بھی
کس طرح پیٹ کی بھٹی میں پگھلتا ہے دماغ
تم اُجالوں میں رہا کرتے ہو، تم کیا جانو
کتنے فن پاروں کا دم گھٹتا ہے اندھیاروں میں
خلوتِ عیش سے باہر کبھی نکلو تو سُنو
ذہن کس بھاؤ بکا کرتا ہے بازاروں میں
مجھ سے کیوں پوچھو مری تلخ نوائی کا سبب
میرے سینے میں جو روشن ہے وہ دوزخ دیکھو
تم کو شکوہ ہے مری تلخ کلامی سے مگر
تلخیٔ زیست ہے کیا چیز — یہ مجھ سے پوچھو
میری غزلیں مرے ماحول کا آئینہ ہیں
اپنے احساس کو نظموں میں بدلتا ہوں میں

اب خطادار کہو مجھ کو کہ گستاخ — مگر
آگ کھاتا ہوں تو انگارے اُگلتا ہوں میں
تم کو یہ حق کہ مجھے سرکش و گستاخ کہو
مجھ کو یہ حق کہ میں سچائی کا اعلان کروں
تم کو یہ کام کہ تم موت کی تدبیر کرو
مجھ پہ یہ فرض کہ میں جینے کا سامان کروں

سختی شب

تم نے ہر طرح حکومت پہ تراشے الزام

حق گوئی و بے باکی

میں نے وہ لکھا ہے آپس میں جو کہتے ہیں عوام

سختی شب

تم قلم کاروں نے لکھا ہے حکومت کے خلاف
اور یہ جرم کیا جائے گا ہرگز نہ معاف

شاعر کہتا ہے

میں نے ہر غنچۂ نورس کو تبسم بخشا
میں نے مُرغانِ خوش الحاں کو ترنم بخشا
موجِ بوئے گلِ خنداں کو تلاطم بخشا
وسعتِ دشت میں ہر نعرۂ ہُو میرا ہے
رگِ ہر برگِ گلستاں میں لہو میرا ہے

میں نے سوئی ہوئی موجوں کو روانی دی ہے
میں نے اُجڑی ہوئی دھرتی کو جوانی دی ہے
میں نے عنوانِ تمنّا کو کہانی دی ہے
میں کہ تاریخِ چمن میں رہا لالہ بن کر
میں ہر اک دَور میں اُبھرا ہوں اُجالا بن کر
میں نے ہر سنگ کے سینے پہ شکن ڈالے ہیں
میں نے مر مر کے یہ علم اور یہ فن پالے ہیں
میں نے فولاد کو پگھلا کے قلم ڈھالے ہیں
سنگ و آہن سے کبھی صد جام و سبُو لیتا ہے
یہ قلم سرحدِ تقدیر کو چھُو لیتا ہے
یہ قلم ظلم کا اور جبر کا حامی نہ ہوا
یہ قلم منکرِ تحریکِ عوامی نہ ہوا
اس قلم سے کبھی اقرارِ غلامی نہ ہوا
یہ قلم گوشۂ زنداں میں رواں ہوتا ہے
یہ قلم دار کے سائے میں جواں ہوتا ہے
ظلمتِ جور و ستم جب کبھی لہراتی ہے
زیست جب عرصہ گہہِ دار تک آجاتی ہے
رات جس عہد میں بھی اپنے کو دُہراتی ہے

اُس گھڑی نظموں کی قندیل جلا دیتا ہوں
میں نہ تو قلم چھوڑ کے تلوار اُٹھا لیتا ہوں

سختیٔ شب آگے بڑھی

ضبط ہوتی ہے ہر اک نظم بنامِ قانوں
ملک میں پھیلنے پائے نہ بغاوت کا جنوں

شاعر نے کہا

میرے افکار میں ہر چاک گریبانِ وطن
میری تخئیل میں ہر لاشۂ بے گور و کفن
میرے اشعار میں تاریخ کے ماتھے کی شکن
آدمی بھی ہے مری نظم — اسے ضبط کرو
زندگی بھی ہے مری نظم — اسے ضبط کرو
گیت ہیں کوچہ و بازار، تمھیں کیا معلوم
گیت ہیں یہ در و دیوار، تمھیں کیا معلوم
گیت ہر مفلس و نادار، تمھیں کیا معلوم
دلِ طوفاں کو بھی زیرِ رسن و دار کرو
ہو جو ممکن تو قیامت کو گرفتار کرو
ضبط ہو کر بھی کوئی گیت نہیں مر سکتا
کوئی سورج کو نظر بند نہیں کر سکتا

ہنگامۂ گیر و دار اٹھا

قید خانے کا تمھیں گوشہ دیا جائے گا
تم کو ہر طور سے خاموش کیا جائے گا

شاعر نے کہا

لیکن اے پیروں میں زنجیر پنہانے والو
اے مری راہ میں دیوار اُٹھانے والو
اے اُبھرتے ہوئے سورج کو چھپانے والو
صرف اک موج نہیں ہوں کہ دبا دو گے مجھے
میں کوئی شمع نہیں ہوں کہ بجھا دو گے مجھے
بے شمار اشکوں سے جو بنتا ہے وہ راز ہوں میں
ان گنت نغموں کی لَے جس میں ہو وہ ساز ہوں میں
یعنی اک فرد نہیں، قوم کی آواز ہوں میں
اور یہ آواز کسی سے بھی دبائی نہ گئی
یہ وہ قوت ہے جو طاقت سے مٹائی نہ گئی
مردِ گفتار بھی ہوں، غازیٔ کردار بھی ہوں
شاخِ گُل ہی نہیں، چلتی ہوئی تلوار بھی ہوں
میں کہ شاعر بھی ہوں اور وقت کی رفتار بھی ہوں
اور یہ وقت کی رفتار —— کہاں رُکتی ہے؟
دستِ تاریخ کی تلوار —— کہاں رُکتی ہے؟

تم مجھے ظلمتِ زنداں میں چھپا سکتے ہو
تم مرے واسطے طوفان اُٹھا سکتے ہو
زہر دے سکتے ہو، پھانسی پہ چڑھا سکتے ہو
لیکن، اس زہر کے پیالے کی کھنک کیا ہوگی
بیڑیوں میں جو پلے گی وہ چھنک کیا ہوگی
جرأتِ زیست جو پردوں میں چھپا دی بھی گئی
میری حق گوئی جو مٹّی میں ملا دی بھی گئی
میری آواز اگر آج دبا دی بھی گئی
میری رکتی ہوئی سانسوں کی ہمک بولے گی
میرے گھٹتے ہوئے سینے کی دھڑک بولے گی
تختۂ دار پر بے جان بدن بولے گا
خون سے میرے کھلے گا جو چمن، بولے گا
میں جو ہو جاؤں چپ — میرا کفن بولے گا

طوفان نے انگڑائی لی

عوام سوچتے ہیں

کب تک آخر یہ ستم اور یہ دکھ درد سہیں
روح بے چین ہے جس غم سے اُسے کیوں نہ کہیں
حاصل اب کچھ بھی نہیں خارِ مغیلاں کے سوا
منزل اب کوئی نہیں پستیٔ زنداں کے سوا
اپنے دکھ درد کے اور اپنی مصیبت کے خلاف
ہم اب آواز اُٹھائیں گے حکومت کے خلاف

عوامی للکار

زخمِ سر کچھ بھی نہیں، زخمِ جگر کچھ بھی نہیں
رسن و دار بجز گردِ سفر کچھ بھی نہیں
ختم ہر سلسلۂ جور و ستم کر ڈالو
اُٹھو — گل چینوں کے ہاتھوں کو قلم کر ڈالو
بڑھ چلو روند کے کانٹے جو ملیں راہوں میں
لوٹ لو اُن کو جو دبکے ہوں کمیں گاہوں میں

بوڑھا دادا

نقرئی کرنوں نے ظلمت کا بھرم توڑ دیا
چیخ کر دیر کے سناّٹے نے دم توڑ دیا
ہر طرف موج سی اُٹھنے لگی بیداری کی
یعنی انسان نے جاگ اُٹھنے کی تیاّری کی
جمع ہوتے گئے لوگ اور علم بڑھتے گئے
بازو لہراتے گئے اور قدم بڑھتے گئے
جیسے اب جیل نہیں، پاؤں کی زنجیر نہیں
جیسے کوڑے نہیں، گولی نہیں، تعزیر نہیں
نہ شکستوں کا تصوّر تھا نہ امن کی تلاش
صرف انسان کو تھی انسان کے دشمن کی تلاش
ایک ہی نغمہ ہر اک ساز میں بل کھاتا تھا
ایک ہی نعرہ ہر اک ہونٹ پہ لہراتا تھا

؎ ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

---

۵ ۲ر اگست ۱۹۴۲ء کو مہاتما گاندھی نے ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ دیا۔

تاریخ بتاتی ہے

شمعِ آزادی کے پروانے بڑھے جاتے ہیں
اپنا پرچم لیے دیوانے بڑھے جاتے ہیں
اُن کے ہونٹوں پہ مہکتا ہے محبت کا غرور
اُن کے ماتھوں پہ دمکتا ہے صداقت کا غرور
ان کے ذہنوں میں نئے دَور کی تعمیریں ہیں
ان کے سینوں میں نئی صبح کی تنویریں ہیں
تیوریاں جہدِ مسلسل کا پتہ دیتی ہیں
نظریں مستقبلِ زریں کو صدا دیتی ہیں
لاکھ مجبور ہیں، لاچار ہیں، پربستہ ہیں
موت سے آنکھ ملانے پہ کمربستہ ہیں
جگمگاتا ہی گیا ذہن و نظر کا فانوس
اور چلتا گیا — بڑھتا گیا سڑکوں کا جلوس
شوقِ بےباک و جواں زخمہ زنِ ساز ہوا
ایک اک فرد ہم آہنگ و ہم آواز ہوا

ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

طوفان بڑھتا جاتا ہے

بوڑھا دادا

اور پھر مادرِ بھارت کے پھریرے کے تلے
لوگ آتے گئے، آتے گئے، آتے ہی گئے
جگمگاتا ہی گیا ذہن و نظر کا فانوس
اور — بڑھتا گیا، چلتا گیا سڑکوں پہ جلوس

سختیٔ شب نے ٹوکا

باغیو! کس کی قیادت نے بنایا ہے جلوس
کیوں اندھیرے میں جلائے گئے نوری فانوس
کس نے یاں تم کو کیا جمع — سناؤ مجھ کو
منتظم کون ہے جلسے کا؟ — بتاؤ مجھ کو

عوام نے کہا

منتظم؟ — گویا کہ تم کو نہیں اتنی بھی خبر
جب دھواں سینۂ انساں سے اُٹھا کرتا ہے
وقت اِن جلسوں کی تنظیم کیا کرتا ہے

اور قیادت کے لئے غیر نہیں آتا کوئی

ہم ہیں ہر فرد مجاہد بھی ہے اور رہبر بھی
ہم سبھی زیست کی عظمت کے لئے اُٹھے ہیں
ہم سبھی اپنی حفاظت کے لئے اُٹھے ہیں
ایک اعلانِ صداقت کے لئے اُٹھے ہیں

سختیٔ شب نے جھڑکا

کس کے بھڑکانے سے تم نے یہ شرارت کی ہے
کیوں سرِ راہ نکل آنے کی جراٗت کی ہے
پھر اُسی ظلمتِ ماحول و نظر میں کھو جاؤ
جاؤ تم اپنے گھروندوں میں دبک کر سو جاؤ
سن رکھو سخت ہیں ہم ظلم ہیں ہم، قہر ہیں ہم
جاؤ بھاگو کہ اُجالوں کے لئے زہر ہیں ہم

عوام چیخ اُٹھے

تم نے ایک ایک رگِ گل کا لہو چوس لیا
تم نے گلزار کا ہر جوشِ نمو چوس لیا
تم نے ہر برگ کو پابندِ رسن رکھا ہے
تم نے ہر پھول کے کاندھے پہ کفن رکھا ہے
شعبدے ختم کرو ـــ اہلِ نظر جاگ اٹھے
ظلمتو! بھاگو کہ انوارِ سحر جاگ اُٹھے

غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

وقت کی آواز

ختم ہر سلسلۂ جور و ستم کر ڈالو
اٹھو گلچینوں کے ہاتھوں کو قلم کر ڈالو
بڑھ چلو روند کے کانٹے جو ملیں راہوں میں
لوٹ لو ان کو جو دبکے ہوں کمیں گاہوں میں

وہم ابھرنے لگا

یہ اہنسا کی جنم بھوم، یہ گوتم کی زمیں
اس کو بدنام کرے داغِ تشدّد نہ کہیں؟

ذہن آگے بڑھا

کسی اعلانِ صداقت کو تشدّد نہ کہو
وقت کی سخت ضرورت کو تشدّد نہ کہو
شبِ تاریک سے نفرت کو تشدّد نہ کہو
نورِ ہستی سے محبّت کو تشدّد نہ کہو
ظلم کا راج مٹانے کو تشدّد نہ کہو
قوم کی آن بچانے کو تشدّد نہ کہو

ورنہ۔ پھولوں کا مہکنا بھی تشدّد ہو گا
دل کا سینے میں دھڑکنا بھی تشدّد ہو گا
صبح ہونے کا قرینہ بھی تشدّد ہو گا
سانس کا لینا بھی، جینا بھی تشدّد ہو گا

وہم نے پھر کہا

لیکن انسان کو انسان سے نفرت کیسی
اپنے ہم جنسوں سے اس درجہ عداوت کیسی؟

ذہن سمجھا گیا

یہ لڑائی کسی انسان سے انساں کی نہیں
دشمن اپنا ہے فقط جبر و تشدّد کا نظام
اپنے ہم جنسوں سے کب، ظلم و ستم سے ہے یہ جنگ
ظلم ہوتا تو نہیں ہے کسی انسان کا نام
نہ کسی قوم سے ___ نہ انسان سے لڑنا ہے ہمیں
صرف اندھیارے کے طوفان سے لڑنا ہے ہمیں

وہم کہتا رہا

کل کوئی یہ نہ کہے ہم نے حماقت کی تھی
کہیں تاریخ نہ لکھے کہ بغاوت کی تھی؟
ملک ہو جائے زمانے میں نہ بدنام کہیں
سر پہ آ جائے نہ تخریب کا الزام کہیں؟

ذہن کا فیصلہ

جنگ — ظلمات کو انوار بنانے کے لئے
جنگ — ویرانے گلزار بنانے کے لئے
جنگ — رخساروں کو شاداب بنانے کے لئے
جنگ — پیشانی کو مہتاب بنانے کے لئے
جنگ — سرمائے کے بہروپ سے بچنے کے لئے
جنگ — سولی کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لئے
جنگ — دھرتی کی اور انساں کی حفاظت کیلئے
گر بغاوت ہے — تو راضی ہیں بغاوت کے لئے

وہم کہتا گیا

تم نے سوچا بھی ہے انجامِ بغاوت لیکن ؟
موت — جس سے نہیں انسان کا لڑنا ممکن ؟

تاریخ نے بتایا

کوئی بھی زیست کو پابند نہیں کر سکتا
موت مر سکتی ہے، انسان نہیں مر سکتا

عوامی نعرہ

جنگ — پیروں کی یہ زنجیر گلانے کے لئے
جنگ — اس داغ غلامی کو مٹانے کے لئے
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

بوڑھا دادا

نو رزادوں کی یہ للکار مصیبت لائی
رات کے راج دلاروں پر اک آفت آئی
ظلمتیں گہری ہوئیں ۔ اور اُمنڈ آنے لگیں
بیڑیاں بڑھنے لگیں، سختیاں دھمکانے لگیں
جگمگاتا ہی گیا، ذہن و نظر کا فانوس
اور بڑھتا گیا ۔ چلتا گیا سڑکوں پہ جلوس
سامنے سیکڑوں بندوقوں کی نالیں تھیں ۔ مگر
ابن آدم کو کہاں روک سکا موت کا ڈر
ایک ہی نغمہ ہر اک ساز میں بل کھاتا رہا
ایک ہی نعرہ ہر اک ہونٹ پہ لہراتا رہا

غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

بوڑھا دادا

اپنی تذلیل پہ بل کھا گیا کالا قانون
کھول اٹھا زعمِ حکومت کی رگِ ظلم کا خون
گولیاں چلنے لگیں تاک، تڑاک ۔ اور تڑاک
جسم انسانوں کے گرنے لگے ۔ دھم، دھاک، دھڑاک

کھلتی کلیاں زرد ہوئیں

بوڑھا دادا

دم نکلتا ہے کہیں ـــــ جسم تڑپتا ہے کہیں
کہیں چیخیں ہیں کہیں آہ ـــ کہیں کچھ بھی نہیں
سر بہ زانو نظر آتا ہے وجودِ ہستی
دُور و نزدیک نہیں کوئی نمودِ ہستی
زیست کا پیرہنِ حسن بہت میلا ہے
خاک پر لاکھوں شہیدوں کا لہو پھیلا ہے
ان میں بوڑھے بھی، جواں مرد بھی ہیں، بچے بھی
پر کہ ہمت کے دھنی ۔ بات کے تھے سچے بھی

بے یقیں کانپ اُٹھے

اس طرف، گوشۂ میداں میں ۔ وہ کڑیل سا جواں
جس کے سینے میں کسی شوخ کی اُلفت تھی نہاں
ہو گئی نذرِ خزاں جنتِ ہستی کی بہار
مل گیا خاک میں اک تاج محل کا معمار
اب یہ بازو کوئی کشتی بھی نہیں کھے سکتے
اب یہ لب پیار کے دو بول نہیں دے سکتے

دیکھ مے خانۂ نجد! اب ترا ساقی نہ رہا
بے ستوں کاٹنے والا کوئی باقی نہ رہا
اب نہ اُبھرے گی کہیں صبح مسرّت کوئی
اب نہ دیکھے گا کوئی خوابِ محبّت کوئی
ہیر تک تک کے ہر اک راہ کو رہ جائے گی
سوہنی کچّا گھڑا تھام کے بہہ جائے گی

اور، اس سمت، وہ اک نرم و جواں سی عورت
جس میں پوشیدہ تھی تخلیقِ بشر کی قوت
جس کی رعنائی کا ہر رنگ ہوا ہے پھیکا
جس کی پیشانی پہ ہے زخم کا رنگیں ٹیکا
یہ ــــ جو بے جان ہے پیوند لگی ساری میں
تھی اک انساں کو جنم دینے کی تیاری میں
گود بھرنے بھی نہ پائی تھی کہ دم ٹوٹ گیا
موت کے سامنے ہستی کا بھرم ٹوٹ گیا
خون میں تقدیرِ زماں ڈوب چکی ہے۔ دیکھو
نبضِ تعمیرِ جہاں ڈوب چکی ہے۔ دیکھو
زندگی کا کوئی جلوہ نہ ہویدا ہوگا
یعنی اس کوکھ سے انسان نہ پیدا ہوگا

اور یہ سامنے، اک سمت ——— پڑا ہے تنہا
خاک اور خون میں لتھڑا ہوا ننھا بچہ
جانے کس گود کو بے درد اجل لوٹ گئی
جانے کس باپ کی لاٹھی تھی کہ جو ٹوٹ گئی
پیار تھا کس کی بہن کا کہ جو خاموش ہوا
چاند تھا کون سے آنگن کا جو روپوش ہوا
یہ وہ غنچہ تھا جو صحرا کو کھِل سکتا تھا
یہ وہ انساں تھا جو دنیا کو بدل سکتا تھا
اب — یہ وہ مہر ہے جس میں کوئی تنویر نہیں
اب — یہ وہ خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں
تان اڑنے بھی نہ پائی تھی کہ لَے ٹوٹ گئی
گیت اُبھرنے بھی نہ پایا تھا کہ لَے ٹوٹ گئی
سرنگوں زیست کا عنوان ہوا جاتا ہے
پالنا آج سے ویران ہوا جاتا ہے

اور اُدھر، پیڑ کے نزدیک — پڑا ہے مزدور
جس کے تیور سے عیاں اب بھی ہے محنت کا غرور

جس کے ماتھے پہ محبّت کا جمال اُبھرا ہے
جس کے ہاتھوں پہ مشقّت کا جلال اُبھرا ہے
جس کے بل بوتے پہ تعمیرِ جہاں ہوتی ہے
جس کی ہر سانس میں تقدیر نہاں ہوتی ہے
جس کے اشکوں سے جلا کرتے ہیں ایواں میں کنول
جس کی ایک آہ بناتی ہے کئی تاج محل
اب کوئی دشت کو گلزار نہیں کر سکتا
خوابِ تعمیر کو بیدار نہیں کر سکتا
اب نہ چیرے گا کوئی سینۂ کہسار
اب نہ جاگے گا کہیں محنتِ آدم کا وقار
اب چٹانوں سے نہ اُبھرے گا اجنتا کوئی
پتھر اگلیں گے نہ دھرتی پر ایلورا کوئی
تند طوفاں میں گزر کون کرے گا — بولو
معرکہ زیست کا سر کون کرے گا — بولو

اور یہ پاس ہی دس بارہ برس کا لڑکا
جس کے سینے پر ہے بکھرا ہوا اس کا بستہ
طالب علم تھا، پایا جو ورق پڑھ ڈالا
موت کی گود میں جینے کا سبق پڑھ ڈالا

تھم گئی زلیست کہ شہپر نہ کہیں تھک جائے
ڈھونڈھنے علم کو جانے یہ کہاں تک جائے
کوئی پیغام کہ لے آتا یہ الہام کوئی
کیا خبر یہ کوئی گوتم تھا کہ تھا رام کوئی
کون جانے یہ تلک ہوتا کہ ٹیپو بنتا
کس کو معلوم یہ آزاد[۵۱] کہ نہرو بنتا
کون کہہ سکتا ہے یہ بوس[۵۲] کی تصویر نہ تھا
کس کو معلوم کہ یہ قوم کی تقدیر نہ تھا
شاید اک روز اٹھاتا یہ صداقت کا علم
شاید اک روز بھگت سنگھ اسے کہتے ہم
ہجو سودا کی یہ تھا نبض کہ جو چھوٹ گئی
میر کا سوز تھا یہ جس کو اجل لوٹ گئی
عظمت شوخی مومن تھا کہ جو دور ہوا
فکر غالب تھا جو پرواز سے معذور ہوا
فن اکبر کی یہ الفاظ پرستی ڈوبی
حضرت داغ کے جذبات کی مستی ڈوبی

---

۵۱ ابوالکلام آزاد ۔ ۵۲ سبھاش چندر بوس

زندگانی کے لئے موت کا پیغام آیا
یعنی اقبال کا شاہین تہہِ دام آیا

کسی تلسی کا تخیل تھا جو منہ موڑ گیا
یا کوئی سنت کبیرا تھا جو دم توڑ گیا

بھارتیندو کی سنواری ہوئی "اودھی" روٹھی
اک شرت چندر کی افسانہ طرازی کھوئی

کسی بنکم کا کوئی دکھ بھرا افسانہ گرا
دستِ خیّام سے یا چھوٹ کے پیمانہ گرا

ایک جے شنکر پرشاد تھا جو روٹھ گیا
کسی شبلی کا فسوں کار قلم ٹوٹ گیا

ذوق کا کوئی قصیدہ تھا جو خوابیدہ ہوا
حالیِ عصر تھا جو خون میں غلطیدہ ہوا

عالم "باغ و بہار"[۱ہ] اب نہ نمایاں ہوگا
"بالِ جبریل"[۲ہ] کبھی اب نہ پر افشاں ہوگا

قوتِ "ضربِ کلیم"[۳ہ] اب نہ دکھائی دے گی
اب کہیں "بانگِ درا"[۴ہ] تک نہ سنائی دے گی

۱ہ باغ و بہار، مصنفہ میر امن دہلوی۔ ۲ہ بالِ جبریل علامہ اقبال ۳ہ مزب کلیم علامہ اقبال ۴ہ بانگ درا، علامہ اقبال۔

اٹ گئے خاک میں اک "ماہ جبیں"[۵۱] کے گیسو
رہ گیا ٹوٹ کے "گیتانجلی"[۵۲] کا جادو
"زہر عشق" اب سے نہ ٹھہرے گا کبھی قند و نبات
اب کسی کو بھی ملے گا نہ یہاں "آبِ حیات"[۵۳]
اب نہ دہرائے گا "خوجی"[۵۴] کا بھی قصّہ کوئی
اب نہ پائے گا "گئو دان"[۵۵] میں حصّہ کوئی
"ست سئی"[۵۶] اب نہ کرے گی ہمیں جنت بکنار
"میگھ دوت"[۵۷] اب نہ یہاں لائے گا پیغامِ بہار
"سور ساگر"[۵۸] میں کوئی موج نہ اُبھرے گی کبھی
درسِ "گیتا"[۵۹] پہ کوئی فوج نہ اُبھرے گی کبھی
زیست کو اب نہ ملے گا کوئی "میدانِ عمل"[۶۰]
مٹ گیا عرصۂ ہستی سے ہر امکانِ غزل
جہل کی زلف کھُلی ہے تو بکھر جائے گی
موت کو ڈھیل ملی ہے تو اُبھر جائے گی

---

۵۱ ماہ جبیں، مثنوی زہرِ عشق کی ہیروئن۔ ۵۲ گیتانجلی۔ ٹیگور۔ ۵۳ آبِ حیات، محمد حسین آزاد۔ ۵۴ فسانۂ آزاد کا ایک کیریکٹر۔ ۵۵ گئو دان، پریم چند۔
۵۶ ست سئی، بہکاری داس۔ ۵۷ میگھ دوت، کالی داس۔ ۵۸ سور ساگر، سور داس۔
۵۹ بھاگوت گیتا۔ ۶۰ میدانِ عمل، پریم چند۔

زندگی کا کوئی سامان نہ پیدا ہوگا
جانور ہوں گے ــــ اب انسان نہ پیدا ہوگا

یقین نے کہا

کون کہتا ہے اب انسان نہ پیدا ہوگا
زیست کا کوئی بھی عنوان نہ پیدا ہوگا
زندگی میں ہے بڑا جوشِ نمو یاد رہے
رنگ لاتا ہے شہیدوں کا لہو، یاد رہے
سینۂ تیرگی سورج کے قدم لیتا ہے
موت کی گود میں انسان جنم لیتا ہے

صدائے مستقبل

اپنے سینوں کے شگافوں کے لئے غم نہ کرو
کہ انھیں راہوں سے اک چندر کرن آئے گی
یوں ہی رہنے دو شہیدوں کی یہ پھیلی باہیں
کہ نئے دور کی نوخیز دلھن آئے گی
لاکھ تخریب ہو ــــ تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

طوفان اور بپھرتا ہے

انسان کی آواز

ذہنِ تخلیق میں جب کوئی خیال اُبھرا ہے
بزمِ تعمیر میں جب کوئی سوال اُبھرا ہے
میرے ہاتھوں پہ مشقت کا جلال اُبھرا ہے
"تاج" بن کر مری محنت کا جمال اُبھرا ہے
بے جھجک ہر سفرِ دار کیا ہے میں نے
زہر کا جام بھی ہنس ہنس کے پیا ہے میں نے
میں ہر اک طور سے اُجڑا مگر آباد رہا
میں کہ زنجیروں کے حلقوں میں بھی آزاد رہا
میں غم و درد بھی سہ کر طرب ایجاد رہا
لاکھ شعلوں میں رہا پھر بھی چمن زاد رہا
میں کبھی راہِ صداقت سے بھٹک سکتا نہیں
میرا سر ٹوٹ تو سکتا ہے لچک سکتا نہیں

ہو کوئی دور — یہی ایک چلن ملتا ہے
زیست کو تحفہ صد رنج و محن ملتا ہے
حق پرستوں غم کو طوق و رسن ملتا ہے
زندگی مانگنے والوں کو کفن ملتا ہے
مرحلہ زیست کا سولی ہی پہ سر ہوتا ہے
زہر پینے ہی سے سقراط امر ہوتا ہے

موسم گل جو کبھی قید ہوا ہو تو ڈروں
کسی طوفاں کو کوئی روک سکا ہو تو ڈروں
گرد اڑانے سے مہِ نو جو چھپا ہو تو ڈروں
نور ظلمت کے دبانے سے دبا ہو تو ڈروں
ظلم جس رنگ میں بھی چاہے ۔ اُبھر سکتا ہے
لیکن انسان — نہ مرتا ہے ، نہ مر سکتا ہے

اُوس کی بوند جو پیمانہ شکن ہو تو کہو
ظلم صرصر ہی جو تاریخ چمن ہو تو کہو
ابدی مرحلۂ دار و رسن ہو تو کہو
قید خانہ کسی یوسف کا وطن ہو تو کہو
ٹھوکریں کھاتا ہے انسان سنبھلنے کے لئے
آدمی مرتا ہے دُنیا کو بدلنے کے لئے

دہن و نطق پہ ڈالے تو گئے قفل ــــ مگر
ایک لمحے کو بھی حق گوئی پہ آیا نہ اثر
سانچ کو آنچ نہیں، سچ کو نہ خطرہ ہے نہ ڈر
لب جو خاموش رہے بھی ہیں تو بولی ہے نظر
جو دوامی ہوں وہ پیغام دیئے ہیں ہیں نے
بند ہونٹوں سے بڑے کام لیئے ہیں ہیں نے

سچ کی آواز دبانے سے اُبھر جاتی ہے
بوئے گل بند دریچوں سے گذر جاتی ہے
زندگی اپنا لہو دے کے نکھر جاتی ہے
موت ٹکراتی ہے انساں سے تو مر جاتی ہے
جادۂ حق میں کوئی موڑ، کوئی پھیر نہیں
دیر تو ہوتی ہے لیکن کوئی اندھیر نہیں

مے اُبلتی ہے تو پیمانوں میں ڈھلنے کے لیئے
آندھیاں چلتی ہیں موسم کو بدلنے کے لیئے
موج دبتی ہے جو کوئی تو اُچھلنے کے لیئے
سُرخ ہوتا ہے جو لوہا تو پگھلنے کے لیئے
قسمتِ نور میں ظلمت کی غلامی تو نہیں
رات تاریک تو ہوتی ہے دوامی تو نہیں

تُند طوفانوں میں ساحل کی جھلک ہوتی ہے
سخت نیزوں میں بھی شاخوں کی لچک ہوتی ہے
سینۂ خار میں پھولوں کی کمک ہوتی ہے
قطرۂ آب میں موتی کی چمک ہوتی ہے
اس یقیں ہی کے چمن کا گلِ لالہ ہوں میں
اسی ایمان کی مشعل کا اُجالا ہوں میں

تاریخ بتاتی ہے

وہ گرجتا ہوا طوفان جو سینوں میں اُٹھا
اور اُبلتا ہی گیا — اور اُمنڈتا ہی گیا
عزم ذروں نے کیا یہ کہ ستارے بن جائیں
قطرے اس واسطے جاگ اٹھے کہ دھارے بن جائیں
ان گنت لوگ لئے تیغ و علم جاگ اُٹھے
سیکڑوں ہاتھوں میں بے باک قلم جاگ اٹھے
گولیاں چلتی رہیں تاک، تڑاک اور تڑاک
جسم انسانوں کے گرتے رہے دھم، دھاک، دھڑاک
جسم گرتے بھی گئے۔ جسم سسکتے بھی گئے
لیکن انساں تھے کہ آگے ہی سرکتے بھی گئے
حوصلہ دب نہ سکا ذوقِ سفر تھک نہ سکا
گولیاں تھک گئیں انسان مگر تھک نہ سکا

زندگی موت کو ٹھکرا کے گزرتی ہی رہی
بند ہونٹوں سے بھی آواز اُبھرتی ہی رہی

ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

بوڑھا دادا

اسی آواز نے افسونِ ستم توڑ دیا
نور زادوں نے اندھیروں کا بھرم توڑ دیا
زیست کی صورت شاداب نکھر ہی آئی
روشنی رات کے پردوں سے اُبھر ہی آئی
تیرگی ختم ہوئی — نورِ سحر جاگ اُٹھا
کلیاں بیدار ہوئیں، ہر گلِ تر جاگ اُٹھا
بندشیں دور ہوئیں، ذوقِ سفر جاگ اُٹھا
جذبِ دل جاگ اٹھا حسنِ نظر جاگ اُٹھا
صبحِ نو آئی تو خوابیدہ بشر جاگ اُٹھا

جشن جمہوریت

آج انساں کو مشیت کے پیام آئے ہیں
آج تاریخ کے صفحوں پہ عوام آئے ہیں

آج ہر رُخ سے ہوا عظمتِ آدم کا ظہور
آج ہر جشن مسرّت ہے بنامِ جمہور
آج سے صبحِ وطن عرش مقامی ٹھہری
آج سے عشرتِ امروز عوامی ٹھہری
آج ہم، بستۂ زنجیرِ ستم ہیں آزاد
سُرخیٔ خونِ شہیدانِ وطن! زندہ باد

شہیدوں کی آواز

لیکن اس خونِ گرامی کو پشیماں نہ کرو
خاکِ عیش میں رنگِ غم و حرماں نہ بھرو
دوستو ہوش میں آؤ کہ سفر ختم نہیں
تیرگی کم تو یقیناً ہے مگر ختم نہیں
ابھی ہر گام پہ رہزن کا خطرہ ہے یارو!
کارواں اب بھی سرِ راہ گزر ہے یارو!
اپنے سینوں میں اُبھارے ہوئے جذباتِ عمل
اپنے ہاتھوں میں لئے اپنے سروں کی مشعل
ساتھیو! اور بھی اک بار بہم ہو کے بڑھو
ایک دل، ایک زباں، ایک قدم ہو کے بڑھو
کئی نغموں میں بھی اک لہجۂ اِک آواز رہے
کئی جلوے ہوں مگر ایک ہی انداز رہے

زندگی موت کو ٹھکرا کے گزرتی ہی رہی
بند ہونٹوں سے بھی آواز اُبھرتی ہی رہی

ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

بوڑھا دادا

اسی آواز نے افسونِ ستم توڑ دیا
نور زادوں نے اندھیروں کا بھرم توڑ دیا
زیست کی صورتِ شاداب نکھر ہی آئی
روشنی رات کے پردوں سے اُبھر ہی آئی
تیرگی ختم ہوئی — نورِ سحر جاگ اُٹھا
کلیاں بیدار ہوئیں، ہر گلِ تر جاگ اُٹھا
بندشیں دور ہوئیں، ذوقِ سفر جاگ اُٹھا
جذبِ دل جاگ اُٹھا، حسنِ نظر جاگ اُٹھا
صبحِ نو آئی تو خوابیدہ بشر جاگ اُٹھا

جشنِ جمہوریت

آج انساں کو مشیت کے پیام آئے ہیں
آج تاریخ کے صفحوں پہ عوام آئے ہیں

آج ہر رُخ سے ہوا عظمتِ آدم کا ظہور
آج ہر جشن مسرت ہے بنامِ جمہور
آج سے صبحِ وطن عرشِ مقامی ٹھہری
آج سے عشرتِ امروز عوامی ٹھہری
آج ہم، البتہ زنجیرِ ستم ہیں آزاد
سُرخیٔ خونِ شہیدانِ وطن! زندہ باد

شہیدوں کی آواز

لیکن اس خونِ گرامی کو پشیماں نہ کرو
خاکِ عیش میں رنگِ غم و حرماں نہ بھرو
دوستو ہوش میں آؤ کہ سفر ختم نہیں
تیرگی کم تو یقیناً ہے مگر ختم نہیں
ابھی ہر گام پہ رہزن کا خطر ہے یارو!
کارواں اب بھی سرِ راہِ گزر ہے یارو!
اپنے سینوں میں ابھارے ہوئے جذباتِ عمل
اپنے ہاتھوں میں لئے اپنے سروں کی مشعل
ساتھیو! اور بھی اک بار بہم ہو کے بڑھو
ایک دل، ایک زباں، ایک قدم ہو کے بڑھو
کئی نغموں میں بھی اک لہجہ، اِک آواز رہے
کئی جلوے ہوں مگر ایک ہی انداز رہے

بات جو بھی ہو وہ ہم معنی و ہم رنگ رہے
ایک ہی لے سے ہر اک تار ہم آہنگ رہے
ہاں یوں ہی اور ابھی چلتے رہو، بڑھتے رہو
سامنے آئے تو کہسار پہ بھی چڑھتے چلو
ہر نفس ملک پہ مر مٹنے کی تیاری رہے
منزلِ عشرتِ ہستی کا سفر جاری رہے
شاد ہر پھول، ہر اک برگِ چمن زندہ باد
اِک زباں ہو کے کہو۔ قوم و وطن زندہ باد

اختتامیہ

حسبِ معمول کسی گاؤں میں کچھ رات گئے
لوگ چوپال کو آباد کیے بیٹھے ہیں
حسبِ معمول کہن سال و جہاندیدہ لوگ
اپنے ماضی کی روایات لئے بیٹھے ہیں
اور حقے کا سہارا لیے بوڑھا دادا
کہہ رہا ہے کہ ازل سے ہے یہ تقدیرِ حیات
جھوٹ بڑھ بڑھ کے حقیقت کو چھپا دیتا ہے
نور تعمیر کو کھا جاتی ہے تخریب کی رات
ان گنت انجم و مہتاب کا خوں ہوتا ہے
جب کہیں ملتی ہے ظلمات سے انساں کو نجات

حسبِ معمول جواں چہروں نے انگڑائی لی
حسبِ معمول اندھیرے میں کرن جاگ اٹھی

مطبوعات

لکیریں ——— غزلوں کا مجموعہ ——— ایک روپیہ

ہندوستان جاگ اُٹھا – چینی جارحیت کے خلاف
دفاعی نظموں کا مجموعہ (ہندی رسم الخط میں) – پچہتر پیسے

نوائے ایمان – نعت و منقبت کا مجموعہ – پچھتر پیسے

زیرِ طباعت

گلاب کی بات ——— نہرو جی کے وفات سے پیدا شدہ تاثرات کے تحت لکھی جانے والی نظموں کا مجموعہ

نیا ساز نیا انداز ——— قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ

لکیریں
دوسرا ایڈیشن
جس میں ۶۷ئ تک کی غزلیں بھی شامل ہیں

اور

ادبی نظموں کا مجموعہ

دفتر ساہتیہ کار سنسد۔ بیگم وارڈ، پرتاپگڈھ

نظموں کا مجموعہ

گلاب کی بات

نازش کی شاعری کے چند نمایاں خصوصیات اگر کوئی گنوانا چاہے تو اُسے کہنا پڑے گا کہ نیکی، خلوص، درد انسانیت، شرافت جذبات، نکھرا ہوا انداز بیاں آواز اور لہجے میں انفرادیت، سننے اور پڑھنے والوں کو سوچ میں ڈبو دینے کی صفت نازش کی شاعری میں کارگر نظر آتی ہے۔

جتنی نظمیں اُردو میں پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق لکھی گئی ہیں انھیں اگر ہم ایک طرف رکھیں اور دوسری طرف نازش کا یہ مختصر مجموعہ رکھیں تو اسی مجموعہ کا پلّہ بھاری نظر آئے گا۔

فراق گورکھپوری

(زیر طبع)